ڈاکٹر سائرہ ارشاد
لیکچرار، شعبۂ اردو
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی، بہاول پور

مابعد ۹/۱۱ پاکستان کا عصری آشوب اور اردو افسانہ

ABSTRACT

Post 9/11 Modern Controversy and Pakistani Urdu Short Story
By Dr. Saira Irshad, Lecturer, Department of Urdu, Govt. Sadiq College Women University, Bahawalpur.

After 9/11, the west tried to erase Muslim identity. in addition to terrorism and extremism, the lives of people living in Iraq, Afghanistan and Pakistan become a question mark due tothis world war. Pakistan is not only an important country but after 9/11 the better field for world power Afghanistan has been considered neighbouring and friendly country of Pakistan. Urdu short story has always been about social change at the human level. The sad scenes that led to the patrician of India and the after situation of the collapse of Dhaka made the creative experience of Urdu writers after their experiences and observations.at time the marshals that followed were not able to repel these creators even with the atmosphere of repression and freedom of experession. The change in the world after the attacks on the world tradse center and the pentagon did not preserve Urdu short stories at the creation level. In this regard Rasheed Amjad, Mansha Yad, Zahida Hina, Hamid Siraj and many other writers of the country have characterized this current tragedy in term of cultural confrontation, fear,Violence and alienation, which can be traced to the profound influence of 9/11 Urdu short story literature.

Keywords: Extremism, national integrity, paradise, global perspective, explosive toys, chaos, terrorism, modern turmoil.

ایٹمی جنگ کے امکان نے آج بنی نوع انسان کو جس بھیانک خطرے سے دوچار کر دیا ہے اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایٹمی ہتھیار بنانے والے اپنے اقتدار اور مفادات کے تحفظ کی خاطر جنگجویانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اگر دہشت گردی کے مفہوم پر غور کیا جائے تو اس سے مراد شہریوں کے خلاف طاقت کے استعمال یا دھمکی کے ہیں۔ ہمیشہ طاقت ور ممالک اپنے سے کمزور ممالک میں خوف پیدا کرتے ہیں اور ان کے رویوں میں تبدیلی کی خاطر انھیں "دہشت زدہ" کہا ہے۔

"کسی حکومت کو دھمکانے یا خوفزدہ کرنے اور اپنے سیاسی و معاشرتی مقاصد کو آگے
بڑھانے کے لیے اس حکومت کی شہری آبادی یا اس کے کسی حصے کی جان و مال کے

خلاف طاقت یا تشدد کا غیر قانونی استعمال دہشت گردی ہے۔"(۱)

۹/۱۱ کے سانحے نے تیسری دنیا کے ترقی پذیر یا پس ماندہ ممالک کو بے پناہ متاثر کیا۔ اس واقعے کی ذمے داری عربی النسل اُسامہ بن لادن پر ڈالی گئی اور اس کی پشت پناہی کی پاداش میں سرزمین افغانستان پر فوج کشی کی گئی اس لیے دنیا بھر کے مسلمان خصوصی طور پر اس سے متاثر ہوئے:

"اگرچہ اہلِ اسلام میں آپس کے بے شمار اختلافات ہیں لیکن اسلامی بنیاد پسندی نے اسرائیل دشمنی میں انھیں اس طرح سے یک جہت کر رکھا ہے جس میں وہ اپنے سارے اختلافات بھول کر نہ صرف عرب بلکہ غیر عرب حتیٰ کہ ایران اور افغانستان کے باشندے بھی اسرائیل کی تباہی پر کمر بستہ ہیں۔"(۲)

پاکستان کی جغرافیائی اہمیت، ایٹمی قوت اور مسلمان ملک ہونے کے باعث بے حد اہمیت رہی۔ افغانستان کے ساتھ پاکستان کی طویل سرحد اور قبائلی علاقوں کی قرابت داری اپنی جگہ ہدف بناتی گئی۔:

"۹/۱۱ واقعے کے بعد افغانستان پر امریکی حملے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور غیر کی چالوں سے ایک خوف ناک عفریت بنام" پاکستانی طالبان "تخلیق ہوا۔ سردھڑ کی بازی لگانے والے اپنے کاز سے کمٹمنٹ یا پھر گمراہی میں ایسے سرفروش ثابت ہو رہے ہیں کہ جہاں چاہیں خود اُڑتے ہیں اور ساتھ میں سیکڑوں لاشوں کا تحفہ دے جاتے ہیں۔"(۳)

ان حملوں کی منصوبہ بندی میں جہاں عسکریت پسند شامل رہے و ہیں امریکہ اور ہندوستان کی خفیہ سرکاری و نیم سرکاری تنظیموں کو بھی اس کا ذمے دار قرار دیا جاتا رہا۔ ذمے داری جس کی بھی تھی اُس سے قطع نظر اس کا خمیازہ بہر حال غیر مسلح اور امن پسند عوام الناس کو بھگتنا پڑا۔ مایوسی، خوف، لایعنیت، کم مائیگی، دہشت اور شدت پسندی اس معاشرے میں جڑ پکڑنے لگی:

"ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں، گلوبلائزیشن کے شور شرابے کے باوجود، وہ نہ تو امریکہ ہے اور نہ یورپ کا مضافاتی علاقہ۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے جی بھر کے استفادہ کرنے کے باوجود، اپنی روح کے تحفظ کا جذبہ صرف کسی جھوٹے پندار یا" قومی انا "کی دین نہیں ہے۔"(۴)

امریکہ نے کئی اسلامی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیا اور اُن کے اثاثے منجمد کر دیے نیز یہ بھی کہا کہ جو ممالک ان تنظیموں کو کسی بھی قسم کا تعاون یا حمایت کریں گے انھیں بھی دہشت گرد قرار دیا جائے گا:

"یہ اس کا وقت نہیں کہ اس خاص دہشت گردی کے حملے میں براہِ راست ملوث افراد کا پتا چلایا جائے۔ ہمیں ان ممالک پر حملہ کر دینا چاہیے۔ ان لیڈروں کو قتل کر دینا چاہیے۔

ہم ہٹلر اور اس کے اعلیٰ افسروں کا پتا چلانے اور سزا دینے کے بارے میں رسمی ضوابط کے پابند نہیں تھے۔ جس طرح ہم نے جرمن شہریوں پر کارپٹ بم باری کی اور ہم نے شہریوں کو ہلاک کیا وہ جنگ تھی اور یہ بھی جنگ ہے۔"(۵)

اِس ساری پیچیدہ صورتِ حال کو پاکستان اور بیرونِ ملک بسنے والے پاکستانی افسانہ نگاروں نے تواتر سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اس واقعے سے جنم لینے والے مذہبی اور تہذیبی تفاوت کو افسانوں کا موضوع بنایا تو بعض نے اِس صورتِ حال کے نتیجے میں جنم لینے والے خوف، دہشت اور خون ریزی کو اپنا موضوع بنایا۔ ہر دوصورتوں میں پاکستانی اُردو افسانے میں اس واقعہ کے نتیجے میں بدلتے ہوئے سماج اور آفاقی کلچر کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانے آغاز میں جذباتیت لیے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن اب دھیرے دھیرے یہ موضوع جذباتیت سے نکل کر گہرے تاریخی شعور میں ڈھل رہا ہے۔ الطاف فاطمہ کے افسانے "دیدا وید" میں ایک پاکستانی صحافی رپورٹنگ کے لیے بغداد جاتا ہے اور اس اُجڑتے ہوئے شہر کو ماضی اور حال میں جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔ الطاف فاطمہ نے اس افسانے میں بغداد کے بار بار اُجڑنے اور بسنے کا حوالہ دے کر حقیقی تصویر کشی کی ہے کہ اس شہر کے مقدر میں یہی لکھا گیا ہے۔ کبھی یہ "عروس البلاد" کے نام سے شہرت حاصل کرتا ہے اور کبھی شہرزاد کی ایک ہزار راتوں میں سنائی گئی کہانیاں شہرت پاتی ہیں لیکن آج حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ اس افسانے میں بغداد کی زبوں حالی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ شہر کبھی رنگوں اور روشنیوں میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی تباہی و بربادی اس کا مقدر بنتی ہے۔ اس اُجڑے ہوئے دیس کی لڑکی حلیمہ ملکی حالات کی بہتری کے وقت پاکستان میں انتہائی لا اُبالی زندگی گزار رہی تھی مگر ۹/۱۱ کے بعد وہ لڑکی اپنے شہر واپس جاتی ہے اور اس کی اپنی نفسیاتی کیفیت اس شہر کی طرح پیچیدگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک موقع پر وہ صحافی سے کہتی ہے:

"ماں کی حالت بگڑ گئی تو اس کو ہسپتال میں داخل کروانے لے گئی۔ پہلے تو وہ داخل کرنے سے انکار کرتے رہے۔ کرتے بھی کیا اُن کے پاس دوائیں ہیں نہ انجکشن۔ ان کی کوئی بھی مشین درست حالت میں نہیں۔ جب میں نے بہت خوشامد کی کہ ان کو ہسپتال کی چھت کے نیچے ڈال دینے کی اجازت دے دیں۔ میزائلوں، راکٹوں کی وجہ سے شکستہ، تباہ شدہ کھنڈروں کی زہریلی مسموم دھول اور تاب کاری اور تپتے ہوئے فرش پر لیٹ کر ہی، ان کا یہ حال ہے۔ کم ازکم یہ اپنے حصے کی چند سانسیں تو ذرا بہتر ماحول میں لے سکیں گی۔"(۶)

خالدہ حسین عصرِ حاضر کی ان نامور افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا افسانہ "ابن آدم" کسی خاص مقام کے تذکرے پر مشتمل نہیں لیکن اس میں عراق کی صورتِ حال بیان کی گئی ہے۔ "گوانتاناموبے" جیل میں جس طرح قیدیوں پر ظلم

وتشدد کیا گیا اُس کی جھلک ڈاکٹر ابوحمزہ کے کردار میں ملتی ہے کہ جو دشمنوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن اس کا پکڑے جانا اور پھر اذیت ناک تکلیفیں برداشت کرنا موت سے بدتر ہے۔ اس افسانے میں طاقت ور اور مہذب دنیا کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے ان کے ظلم اور ناانصافی کے باوجود انسانی حقوق کی تنظیمیں خاموش تماشائی بن جاتی ہیں۔:

"آدمی یا سگ، معلوم نہیں مگر وہ چار ہاتھ پاؤں پر چلتا تھا۔ کتے سے بڑی جسامت، بالکل برہنہ۔ اس کی برہنگی چوپائے کی مانند عیاں تھی اور اس کی ہڈیوں بھرا ڈھانچہ چوپایوں کی صورت چاروں ہاتھ پاؤں پر چل رہا تھا جب کہ اس کا منہ تھوتھنی کی طرح سامنے اُٹھا تھا اور جھاڑ داڑھی لٹکتی تھی۔"(۷)

محمد حمید شاہد کا افسانہ "موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ" میں دو دوستوں کی کہانی بیان کی گئی ہے جو طالب علمی کے زمانے میں ساتھ رہے اور پھر ایک دوست کی وفات اُن دنوں ہو جاتی ہے جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا اور پوری دنیا میں دہشت پھیلا دی۔ افسانے میں امریکہ کے حوالے سے گہرا طنز کیا گیا ہے جس طرح وہ اپنی مرضی مسلط کرتے ہوئے جہاں چاہے سب کچھ تہہ و بالا کر دیتا ہے اور دیگر ممالک میں حکمران اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کا اقتدار قائم رہے۔:

"دنیا کے بدترین حکمران نے اپنے مہلک ترین اسلحے کے بھرپور استعمال سے سقوطِ بغداد کا مقصد حاصل کرلیا۔ جن مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو اس حملے میں مرنا تھا، مر چکے۔ خود کو انصاف پسند کہلوانے والی مکار دنیا اپنے اپنے مفادات کے تحفظ سے مشروط ہوکر اس ساری درندگی کا جواز فراہم کرنے میں جت گئی ہے۔ اقتدار والے اپنا اقتدار بچانے کے لیے کہتے ہیں ہماری باری نہیں آئے گی۔"(۸)

افسانے میں ایک ایسے شخص کی نفسیات بتائی گئی ہے جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو اپنی ٹانگوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ پہلے وہ اس واقعہ سے لاتعلق رہتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر وحشت طاری ہوتی گئی اور جب اس کی ٹانگیں کٹ جاتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے دل پر وار کیا گیا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو دونوں ٹاورز کے گرنے کے بعد وہاں موجود لوگوں کی ہوئی ہوگی۔ جن کے عزیز اس حادثے کی وجہ سے مارے گئے انھیں بھی دلی صدمہ پہنچا تھا۔

محمد حمید شاہد کا افسانہ "سورگ میں سور" میں ایک ایسی بستی کی کہانی بیان کی گئی ہے جہاں کے لوگ بکریوں کا ریوڑ پالتے ہیں اور اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس کام کو پاکیزہ فریضہ سمجھ کر نہایت ایمان داری سے انجام دیتے ہیں۔ بستی والے سوروں کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ یہ جنگلی "سور" بکریاں ہلاک کر جاتے تھے۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے گاؤں والوں نے کتے پالنے شروع کر دیے لیکن سوروں کی تعداد میں تیزی سے اضافے کی وجہ سے گاؤں والوں کو کتوں کی تعداد بڑھانی پڑی مگر یہ اضافہ بہت معمولی ثابت ہوا:

"یہ کتے ہمارے کھیت اُجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں ..... عادی، خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے..... ممکن ہے ان پلیدوں کے بار بار بدن تان کر کھڑا ہو جانے کے سبب کوئی سہم ان کے دلوں میں سما گیا ہو۔ معاملہ کچھ بھی ہو، صورتِ احوال یہ ہے کہ تھو تھینوں والوں کو غراہٹوں کی اوٹ میسر آ گئی۔"(۹)

اگر اس افسانے کو علامتی طور پر دیکھا جائے تو گاؤں آباد کرنے کی خواہش میں بستیاں اُجاڑ دینے کی فطرت ملتی ہے۔ محمد حمید شاہد نے نہایت خوب صورتی سے بکریوں، کتوں اور سوروں کا استعارہ بیان کیا ہے کہ کس طرح طاقت کا غلبہ پانے والے اپنی من مانی کرتے ہیں اور جو مغلوب ہوں وہ بھی اپنی کوتاہی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں۔

محمد حامد سراج کے افسانے "اندر" میں ایک نفسیاتی مریض کی حرکات وسکنات کو ظاہر کیا۔ افسانہ نگار نے اس موجودہ دور کے نفسیاتی مسائل اور اُن کی وجوہات کو بیان کیا ہے۔ معاشرے میں پیدا ہونے والی بے چینی، نفسیاتی اُلجھنیں اور پریشانیوں کا حل مذہبی جماعتوں کے پاس نہیں بلکہ اُس رَبّ کی ہدایت پر عمل کرنے میں ہے جس کے پاس ہر مشکل کا حل ہے اور جو خود کہتا ہے کہ "ہے کوئی مانگنے والا جسے عطا کروں" جب کہ آج کے دور میں مذہبی جماعتیں اس کا پیغام پہنچانے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کا کام کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہوٹل میں ایک جماعت کو دیکھتا ہے تو اُس کے ساتھ چل پڑتا ہے:

"بہت دن گزرنے پر وہ نہ تو اس رنگ کی پگڑی باندھ سکا اور نہ اس راستے پر چل سکا۔ اسے یوں محسوس ہوا، وہ سب ایک دائرے میں مقید ہیں۔ بس وہ آپس میں ملتے ہیں، ہنستے ہیں، بولتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور جو لوگ اس دائرے سے باہر ہیں وہ ان کو اچھوت سمجھتے ہیں اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"(۱۰)

"چوب دار" میں خوف، جھنجھلاہٹ اور مایوسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دنیا میں امن وسلامتی کا دعویٰ کرنے والوں کا حقیقی روپ دکھایا گیا ہے کہ جو بم دھماکوں، میزائلوں اور راکٹوں سے نسل انسانی کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ افسانے میں موجودہ حالات و واقعات کے حوالے سے اس خوف اور مایوسی کا حوالہ شامل ہے جس نے نفسیاتی طور پر لوگوں کے اذہان کو متاثر کیا ہے اور ہر طرف بے یقینی کی فضا پیدا کی ہے۔ بنیادی طور پر اس افسانے میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ آج کے دور میں یہ دنیا امن وامان کا گہوارہ بننے کی بجائے اسلحے اور بارود کی طرف چل پڑی ہے:

"یہ کون سی صدی ہے جس میں لوہے کو میں نے اُڑان دی تھی۔ یہ بارودی پرندے کیوں منڈلا رہے ہیں.....؟ یہ کیسے تیر ہیں جو آگ اور بارود کی لپک لیے ہزاروں میل

لمحوں میں طے کر رہے ہیں۔"(۱۱)

''گلوبل ولیج'' میں نوجوان کے کردار کو علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ بستی کے نابینا لوگوں میں صرف ایک نوجوان کا بینا ہونا انھیں یہ اُمید دلاتا ہے کہ وہ جلد ہی سائنسی ایجادات کی بنا پر اپنی بینائی حاصل کر لیں گے لیکن نوجوان دنیا میں دہشت گردی، قتل و غارت اور بم دھماکوں سے نا آشنا تھا جس پر بستی کے لوگ اسے بتاتے ہیں کہ:

"جب ہماری بینائی چھن گئی تھی اُس وقت کرہ ارض ایٹم بم کی زد میں تھا۔ دنیا کے سات ممالک نے کامیاب ایٹمی دھماکہ کر کے اپنا لوہا منوایا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد پاکستان نے کامیاب ایٹمی دھماکہ کر کے اپنا لوہا منوایا تھا۔ نت نئے میزائلوں اور تباہ کن ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات بچوں کے کھیل تھے۔"(۱۲)

گاؤں والوں کا صورتِ حال کے حوالے سے آگاہ کرنا موجودہ دور کے مسائل کو ظاہر کرتا ہے کہ بڑی طاقتوں نے کس طرح دوسروں کا جینا حرام کیا ہوا ہے اور ان کے لیے یہ سب کچھ معمول کی بات تھی۔ تیل پر عالمی طاقتوں کا قابض ہونا اور کٹھ پتلی حکومتوں پر تنقید کی گئی نیز کرہ ارض کو جس طرح ایٹمی ہتھیاروں سے کھنڈر بنا دیا گیا تھا، یہ بات انتہائی تشویش ناک تھی۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے چکر میں جہاں جس کا وار چلتا ہے وہ دوسرے کو کچل ڈالتا ہے۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو آنے والی نسلوں کے پاس محبت، خلوص، بھائی چارہ اور امن نہیں رہے گا۔

افسانہ "دائمی حبس" میں خوف اور ذہنی پریشانی کو اُجاگر کیا گیا ہے جو آج کی نوجوان نسل کا بنیادی مسئلہ بن چکا ہے۔ ذہنوں میں جنم لینے والے کئی سوال جب اپنا جواب کھو بیٹھتے ہیں تو پھر ہر طرف بے یقینی اور افسردگی کی فضا چھا جاتی ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد یہی صورتِ حال پیش آئی کہ پوری دنیا پر ایک خوف مسلط ہو گیا کہ کسی بھی وقت، کچھ بھی اُن کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ دنیا میں بسنے والے افراد اپنے آپ کو انتہائی غیر محفوظ سمجھنے لگے۔

لیاقت علی کا افسانہ "مکوڑے" دہشت گردوں کے ناختم ہونے والے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم ان سے جتنی بھی کوشش کر کے جان چھڑا لیں یہ کسی نہ کسی کونے کھدرے میں موجود رہتے ہیں اور دھرتی کی جڑوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن دہشت گردوں کی موجودگی ملکی سالمیت کے لیے خطرہ بن چکی ہے۔ ایک موقع پر دونوں میاں بیوی آپس میں باہمی مشورہ کر کے کچھ امکانی صورتیں پیشِ نظر رکھتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ:

"ایک صورت یہ تھی کہ ہم اس گھر کو کرائے پر اُٹھا رکھیں یا بیچ دیں مگر اِس امکان میں خرابی کی صورت یہ تھی کہ ہم نے خود ہی مکوڑوں کی سنگینی کا اتنا واویلا کر دیا ہے کہ شاید کوئی بھی اسے خریدنے یا کرائے کے لیے لینے پر آمادہ نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اب کسی بھی طرح ہمیں مکوڑوں کے ساتھ جینا سیکھ لینا چاہیے۔ یہ دوسرا حل بھی

شاید اتنا آسان نہیں مگر کیا کریں کوئی تیسرا راستہ بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔"(۱۳)

اس افسانے میں نہایت خوب صورتی سے گھر کی سطح پر شروع ہوتی ہوئی کہانی کو ملکی اور پھر عالمی تناظر میں اُجاگر کیا ہے کہ کس طرح ہمارے خطے میں دہشت گردوں نے اپنا مضبوط ٹھکانہ بنالیا ہے اور اب اُن سے کسی صورت نجات ممکن نہیں ہے لہٰذا ہمیں ان کے ساتھ جینا سیکھ لینا چاہیے ورنہ ہم جس طرح اپنے ملک میں ان کے خلاف واویلا کر چکے ہیں وہ صورتِ حال اب ہمارے لیے ایک آزمائش بن چکی ہے۔ ہماری اسی ''نشان دہی'' کی بدولت ہم پر ڈرون حملے کر دیے جاتے ہیں اور ہم ہر ستم یہ سوچ کر برداشت کرتے چلے جاتے ہیں کہ شاید حالات میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔

افسانہ "پرچھائیاں" میں اضطراب، بے چینی، خوف اور اُلجھن کا شکار آدمی ہمیشہ خوابوں اور حقیقتوں کے باہمی ملاب سے وجود پانے والی توڑ پھوڑ کا شکار رہتا ہے۔ وہ جب کسی کو اپنا خواب سنانے لگتا ہے تو اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ حقیقت تھی جب کہ حقیقت بتانے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواب کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیاقت علی نے اس افسانے میں محض ایک شخص کی نفسیاتی اُلجھن اور پریشانی سے پردہ نہیں اُٹھایا بلکہ معاشرے میں پھیلے انتشار، خوف اور بے یقینی کو اُجاگر کیا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار کا خوابوں اور حقیقی دنیا سے تعلق اِس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اب ہمارے خواب تلخ، ترش اور کڑواہٹ پر مشتمل ہیں جن کا حقیقت سے دور پرے کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس افسانے میں ماضی سے فراموشی اور حال سے بے اعتنائی کا رویہ بھی جھلکتا ہے۔ نئے سال کی آمد پر جب ہر طرف جشن کا سماں ہوتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار گھر والوں کو شش و پنج میں مبتلا کر دیتا ہے جب وہ کہتا ہے:

"میں پٹاخوں اور کریکرز کی آواز کو خوب پہچانتا ہوں۔ یہ کوئی عام پٹاخہ نہیں ہے۔"(۱۴)

ایک شخص کا یہ رویہ "اجتماعیت" پر مبنی ہے کہ ہم بم دھماکوں، دہشت گردی اور خون ریزی کے واقعات کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب ہمیں عام حالات میں بھی یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ ضرور کچھ ہوا ہوگا۔ یہی چیز اس افسانے میں بار بار چونکا دیتی ہے کہ ہم اپنے ماحول میں بے یقینی اور عدم تحفظ کو فروغ دے چکے ہیں اور اب یہی خوف ہمارا وہم بن کر ستاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے ہم کبھی حقیقت سے فرار حاصل کرنے لگتے ہیں اور کبھی خوابوں کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ ایک اَن دیکھا خوف سائے کی طرح ہر وقت ذہن و دل کو جکڑے رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم جس طرح عدم تحفظ کا شکار ہیں ہماری سوچ اور الفاظ بھی تیقن سے محروم ہو جاتے ہیں۔

انور زاہدی کا افسانہ "یہ جنگل کٹنے والا ہے" میں ایک نوجوان ارشد خواب کی صورت ماضی کے بغداد میں خود کو پاتا ہے جہاں ایک تہذیب یافتہ شہر میں کتب خانے جل رہے ہیں، مساجد زمین بوس ہوتی ہیں اور مرنے والوں کی تعداد بچ جانے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ خوابوں کا یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کبھی اُس کے خواب میں "ٹاور آف بیلبون" تباہ ہوتا ہے اور کبھی جہازوں سے بم برسائے جاتے ہیں۔ یوں ارشد مسلسل خوابوں کی وجہ سے ذہنی اُلجھن کا شکار ہے۔ انور زاہدی نے اس

افسانے میں بغداد کے ماضی اور حال کی صورتِ حال بیان کی ہے کہ کس طرح بغداد ٹکڑے ٹکڑے ہوتا رہا اور ہمیشہ تباہی اس کا مقدر بنی۔

> "آسمان سے بمبار جہازوں سے برسائے گئے بموں ..... اور زمین کا سینہ چھلنی کرنے والے راکٹوں ..... اور میزائلوں کی روشنی میں جھلس رہا تھا۔ آگ کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر زمین شہرزاد اور الف لیلیٰ لوٹی جا رہی تھی..... اب سب کچھ نئے انداز میں دہرایا جا رہا تھا..... فضا سے پھینکے گئے بم..... خواجہ نصیرالدین طوسی کے تذکرے کے مطابق ہلاکو نے بغداد کو تخت و تاراج کرنے کے بعد جاتے ہوئے کیا تھا۔ بغداد کو ازسرنو آباد کیا جائے۔ یہی بات ایک تبدیلی کے ساتھ نئے حملہ آوروں نے بھی کہی ہے۔ ہم بغداد کو پھر سے آباد کریں گے۔"(۱۵)

موجودہ عالمی تناظر میں جس طرح دنیا کے لیے مسائل پیدا ہوتے جا رہے ہیں اُن میں بغداد پر برسائے گئے بموں، راکٹوں اور میزائلوں سے کسی طرح چشم پوشی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ یہی بغداد جہاں کبھی رونقیں ہوا کرتی تھیں اب اُجڑ چکا ہے اور اس کی تباہی و بربادی نے ارشد کے ذہن پر اتنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں کہ وہ لاشعوری طور پر ان میں جکڑا رہتا ہے۔

گلزار ملک کے افسانے "عفریت" کا مرکزی کردار ایک عالمی تنظیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس کا کام دنیا میں امن قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے اور اس کا شمار اُن لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو دنیا کو اپنے طریقے سے چلانے کے عادی ہوتے ہیں۔ گلزار ملک نے "عفریت" میں ڈر، خوف اور بے بسی کو یکجا کر دیا ہے۔ وہ نوجوان جو کسی بھی حوالے سے جہادی تنظیموں میں شامل ہوتے ہیں یا اُن کا اِن تنظیموں میں کسی بھی طرح کا کردار ہو، وہ جب دشمن کے نرغے میں آجائیں تو پھر یہ قید اُن کے نہ صرف جسمانی حوالے سے تکلیف کا موجب بنتی ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی نہایت بُرے اثرات مرتب کرتی ہے، جیسے اعلیٰ عہدے دار شخص کے بیٹے کے ساتھ ماجرا ہوا کہ اُس کا باپ بھی بیٹے کی پریشانی پر خوف و ہراس میں مبتلا ہے:

> "ہڈیوں کے ڈھانچہ کی صورت میں اُس کا جوان وجود شاید انھیں عقوبت خانوں کی دیواروں سے چپکا رہ گیا۔ کسی سائے کی مانند..... جو واپس آیا وہ میرا بیٹا تھوڑی تھا۔ ڈرپوک چوزہ تھا۔ سہما ہوا....."(۱۶)

تاریک سرنگیں، جنگی جہازوں کا خوف اور مسلسل ذہنی اذیت نے اُس نوجوان کو بظاہر زندہ رکھا ہوا ہے مگر اُس کی حالت زندوں والی نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے وہ اندر ہی اندر خود کو ختم کر رہا ہے۔ اُس کا واسطہ براہِ راست عقوبت خانے سے پڑا لہٰذا ان حالات کی سنگینی نے اُسے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔

افسانہ "تاریک پڑے لوگ" میں کم وبیش یہی کیفیت ایک بوڑھی عورت فاطمہ کے ساتھ پیش آتی ہے جو آئے روز دھماکوں اور قتل وغارت کے واقعات سن کر وہ بہت فکر مند ہوتی ہے اور کبھی چیخنے چلانے لگتی ہے کہ دشمن واپس اپنے ملک چلے جائیں۔ یہاں کوئی دہشت گرد نہیں ہے۔ اس افسانے میں بھی انسانی نفسیات پر اثر انداز ہونے والی اُس صورتِ حال کو اپنا موضوع بنایا گیا ہے جس کے باعث ملک میں بدامنی، خوف اور بے چینی کا دور دورہ ہے۔ بوڑھی عورت کیوں کہ اپنے گاؤں کے پُرامن ماحول میں رہی تھی لہٰذا شہر کے اِن ہنگاموں نے اسے وحشت زدہ کر دیا ہے:

> "بدبختو! بدبختو! وہ چلا اُٹھی لیکن معلوم نہ پا کہ جنگ لڑنے والے بدبخت تھے یا اُس کا شکار ہونے والے یا پھر تماشا گر فوجیں سرحدی جنگ چھوڑ چکی تھیں۔ اب وہ ایک دوسرے سے گھسیٹی لڑائی لڑ رہی تھیں۔ اس لیے جنگ ہر سو تھی اور کہیں بھی نہ تھی۔ کون کس سے لڑ رہا تھا، مرنے والا کون تھا، مارنے والا کون، کون دوست، کون دشمن، سب معمہ ہی معمہ تھا۔ انیسویں صدی کا معمہ ماچس بندر کے ہاتھوں میں تھی جس کو چاہے جلا کر راکھ کر دے۔"(۱۷)

گلزار ملک نے اِس افسانے میں اُس افراتفری اور ماحول میں پائی جانے والی کشیدگی کو اُجاگر کیا ہے جو صرف ایک معاشرے کا مسئلہ نہیں بلکہ اُس کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ کہیں دہشت گردی کی فضا ہے اور کہیں لوٹ مار کر کے زندگی اجیرن کی جاتی ہے۔ بدامنی کے اس دور میں حقیقت بہت پیچھے چلی جاتی ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹ کا لبادہ اوڑھے فریب دے رہا ہے۔

مصطفیٰ کریم کے افسانے "عجائب گھر" میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی عکاسی کی گئی ہے۔ خاص طور پر اسلام کے حوالے سے جو من پسند تفسیریں بنا لی جاتی ہیں اُن پر گہرا طنز شامل ہے۔ مدرسے میں جب تین فٹ کی برقع پوش خاتون داخل ہوتی ہے تو اُس کا تعارف کچھ یوں کرایا جاتا ہے:

> "جناب یہ ہماری طرح اس مدرسے میں درس دیتی ہے۔ اس پر بھی اللہ کی رحمت ہے۔ کہنے کو تو عمر پچاس سال ہے لیکن اس کے دن بھی کھانے کھیلنے کے ہیں، اپنی گڑیاؤں کو بھی برقعہ پہناتی ہے.....ڈنڈا چلانے میں ماہر ہے۔ امریکہ سے اس کے ایک چچا اس کے گھر آئے جب وہ ظہر کی نماز کے لیے اُٹھے تو اُس نے ڈنڈے سے اس کی ایسی پٹائی کی کہ اب امریکہ میں فزیوتھراپی کروا رہے ہیں۔"(۱۸)

مذہبی گروہوں کی اجارہ داری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب ان پر کسی بھی طرح قابو نہیں پایا جا سکتا نیز فوجی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے طالبان کے پھیلاؤ اور ملک کی سالمیت کو درپیش خطرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ افسانے میں علامتوں اور

استعارات کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے اور اسلوب میں جابجا گہرا طنز ملتا ہے۔

نیلوفر اقبال کا افسانہ "سرخ دھبے" امریکہ کے دو فوجی جوان افسروں کے مابین عراق پر حملے کے بعد کی براہِ رست صورتِ حال پر مبنی ہے۔ ٹونی نے چکن پر کیچپ ڈال کر کھایا اور اب اُس کی جلی ہوئی لاش پر سرخ دھبے نمایاں تھے، افسانے میں انسانی جسم کی ہڈی کو استعاراتی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جیمز اور ٹونی کے رویوں میں تضاد امریکی معاشرے کی سوچ کو ظاہر کرتا ہے۔ امریکہ میں کئی ایسے افراد ہیں جو کے ۹/۱۱ بعد امریکی اقدام کو جائز سمجھتے ہیں جب کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے خیال میں افغانستان اور عراق پر حملے کسی صورت نہیں ہونے چاہییں تھے۔ ایسے افراد کی سوچ جیمز کے کردار سے واضح ہوتی ہے۔:

> "یہ لوگ جنھیں آج ہم Terrorists کہہ رہے ہیں۔ جلد ہی ان کے لوگ انھیں
> ''فریڈم فائٹر'' کہنے لگیں گے اور ہمیں قابل نفرت قابض طاقت.....Occapier۔"(۱۹)

عطیہ سیّد کا افسانہ "بلقیان کا بت" میں افغانستان کے علاقے بلقیان کے ایک گھرانے کا ذکر ہے۔ اس افسانے میں افغانستان کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالی ہے۔ احمد شاہ کے والد کا گھر سے بیگانگی کا رویہ اور کئی کئی دن غائب رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ملک دشمن عناصر کے خلاف کسی تنظیم یا گروہ کا حصہ ہے۔ احمد شاہ اپنے والد کے رویے سے خوف محسوس کرتا ہے جب کہ اسے بت سے اِس قدر محبت ہوجاتی ہے کہ پہروں وہاں موجود رہتا ہے۔ عطیہ سیّد نے بت کے حوالے سے وضاحت نہیں کی لیکن جن اشاروں کو بیان کیا اُن سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بت "بدھا" کا ہے جو امن اور سکون کا پیغام لے کر آیا تھا۔ احمد شاہ کا اس بت سے محبت گہری'' رمزیت'' پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح غیر ملکی جب اِس بت کی مرمت کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ تو انھیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ:

> "یہاں برسوں سے جنگ جاری ہے۔ ہم طوائف الملوکی، بدحالی اور قحط کا شکار ہیں۔
> ہمارے لیے زندگی اور موت یکساں ہیں۔ مرد بلوغت کی حدود میں داخل ہوتے ہی
> درندہ صفت بن جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف اور راکٹ ہیں۔"(۲۰)

دہشت گردی کا نام دے کر احمد شاہ جیسے بے گناہ اور معصوم بچے بارودی کھلونے کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں لیکن عالمی طاقتیں اپنے ایسے اقدامات پر شرمندہ نہیں ہوتیں۔

نجم الحسن رضوی کے افسانے "میلہ مویشیاں" میں بظاہر ایک میلے میں ہونے والی بدمزگی کو موضوع بنا کر معاشرے کے اجتماعی رویے پر تنقید کی گئی ہے۔ نازی دیارِ غیر سے یہاں کی تہذیب و ثقافت کے متعلق جاننے آتی ہے مگر یہاں کے حالات دیکھ کر اسے بہت مایوسی ہوتی ہے۔ آرٹس کونسل کے میلے میں ایک شخص کسی تصویر کو دیکھ کر چراغ پا ہوتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے:

"مصور نے ایک خیال ہی تو پیش کیا ہے اِس میں حسن کا ہیشہ آسیب سے خطرہ رہتا ہے۔ پرستان میں ایسے ہی ہوتا ہے۔'' خیال ''وہ آدمی پھر دھاڑا اور پاؤں زمین پر پٹخ کر بولا! اس خیال کی ایسی تیسی، سبز پری کی یہ توہین..... پورے پرستان کو آگ لگادوں گا میں۔"(۲۱)

نمائش میں موجود شخص تصویر کے حوالے سے "خیال" کو سمجھنے کی بجائے ظاہری طور پر جائزہ لے کر جذبات میں آجاتا ہے اور پھر پورے میلے کا کشیدگی کی صورت اختیار کرنا ایک نہایت افسوس ناک پہلو کی نشان دہی کرتا ہے۔ یوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں بسنے والے افراد انسانیت کی بلند پر پہنچنے کی بجائے غیر انسانی رویے اپنا لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جہاں بیرونی قوتیں اثر انداز ہو رہی ہیں وہیں ہمارا آپس میں اتفاق کا نہ ہونا اور انتشار پھیلائے رکھنا ایک انتہائی تکلیف دہ امر ہے۔

علی حیدر ملک کا افسانہ "دہشت گرد چھٹی پر ہیں" میں مرکزی کردار ''جمیل شیرازی'' کا ہے جو ایک سیمی نار میں تقریر کرتا ہے۔ اِس سیمی نار کا موضوع "دہشت گردی، اسباب اور تدارک" تھا۔ اس افسانے میں ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی وارداتوں کے پس منظر میں اُن خفیہ ہاتھوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو ملکی حالات کی سنگینی کے اصل ذمے دار ہیں۔ جلسے میں خیالات کا اظہار کیا گیا تو مختلف لوگوں نے اپنی اپنی آراء دیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ حکومت اصل حقائق سے توجہ ہٹانے کے لیے خود دہشت گردی کو فروغ دے رہی ہے۔ اس حوالے سے جمیل شیرازی نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا۔:

"دہشت گردی ایک معمول بن گئی ہے۔ معاشرے میں پائی جانے والی ناانصافی اور عدم رواداری کے باعث آئے دن دہشت گردی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور معصوم انسانی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں مگر اس کے باوجود وزراء اور اعلیٰ حکام تواتر کے ساتھ بیان دیتے رہتے ہیں کہ ہم نے دہشت گردی کے خلاف گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔"(۲۲)

یہ افسانہ موجودہ صورتِ حال کے علاوہ ماضی کا بھی عکس ہے۔ ہر دور میں صاحبِ اقتدار کوشش کرتے ہیں کہ عوام ذہن اور زبان سے محروم نہ رہے جب کہ عوام کو ہمیشہ مشکلات پیش آتی ہیں۔

عرفان احمد عرفی کا افسانہ "رئیلٹی شو" ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہے جس میں مسلسل یہی تجسّس رہتا ہے کہ ڈراما اور حقیقت کیا ہے۔ کہانی کا آغاز تھیٹر کے ایک خاص شو سے شروع ہوتا ہے جس میں شائقین کو سخت سکیورٹی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سکیورٹی پر مامور افراد شائقین سے سب کچھ لے لیتے ہیں اور جب وہ اپنی نشستوں پر بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں تو ڈراما شروع ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر میں اداکار اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور دھماکے کے بعد اپنے اپنے رشتہ داروں کو فون کر کے خیریت کی اطلاع دیتے ہیں لیکن وہ تینوں کردار جس سے بھی بات کرتے ہیں وہ خود اپنی خیریت کی اطلاع دینے لگتے، انھیں معلوم ہوتا

ہے کہ نہ صرف شہر کے دوسرے حصوں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی دھماکوں کی آوازیں سنائی دی گئی ہیں۔ کردار اُلجھن کا شکار ہو کے ٹیلی وژن کا رُخ کرتے ہیں تا کہ صحیح صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔ اچانک صورتِ حال یوں پیدا ہوتی ہے۔:

> "پنڈال کے چاروں جانب ایک ساتھ بہت سارے میٹل ڈیٹکٹروں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں جیسے سکینگ مشینوں نے دھات سے بنی کوئی ناقابلِ قبول شے شناخت کرلی ہو۔ ڈیٹکٹروں کی سیٹیاں سوئیوں کی طرح کانوں میں چبھنے لگتی ہیں۔"(۲۳)

اِس افسانے میں موجودہ دور کی بدامنی، تشدد اور دہشت گردی کے عناصر کو اُجاگر کیا ہے جس سے عوام کے دل ودماغ عجیب طرح کی بے چینی اور خوف میں گھر جاتے ہیں۔ اس کی کیفیت اُس وقت محسوس کی جاسکتی ہے جب اچانک دھماکے کی آواز سن کر صورتِ حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی خوف ملکی حوالے سے بھی نظر آتا ہے کہ جب ملک کے کسی گوشے میں انتہائی کشیدہ حالات ہوں تو وہاں موجود عوام الناس کی صورتِ حال کم وبیش 'رئیلٹی شو' کے شائقین کی مانند ہوتی ہے۔

۹/۱۱ نتیجے میں پیدا ہونے والے عصری آشوب نے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے وہاں ادب بھی متاثر ہوا۔ اس تاریخی واقعہ کے تناظر میں جنم لینے والا پاکستانی اُردو افسانہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا، اردو افسانہ نگار خوف، تشدد اور بیگانگیت کی اس صورتِ حال کو اپنا موضوع بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد دنیا میں بدامنی اور انتشار کے گہرے اثرات پر اردو ادب کے نمایاں افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر حساس موضوعات پر قلم آزمائی کی۔ سلطان جمیل نسیم، پرویز انجم، اکرام بریلوی، مسعود صابر، احمد اعجاز، مجید اختر، عاطف سلیم، رابعہ الربا، ہاشم ندیم خان، شہناز خانم عابدی، مسعود مفتی، نجم الحسن رضوی کے افسانوں کا جائزہ لیں تو ان کے پس منظر میں عراق اور افغانستان پر کی گئی بمباری کو اُجاگر کیا گیا ہے نیز اُن محرکات کو ظاہر کیا گیا ہے جو سیاسی واقعات اور صورتِ حال بیان کرتے ہیں۔ ان افسانوں کی بدولت اہلِ مغرب کا مسلم دنیا پر حملہ آور ہونا اور انھیں ہمیشہ مجرم گردانا، مغرب کا مشرق پر اپنے ہتھیاروں سے لیس ہوکر تباہی پھیلانا، انسان کا ماحول میں خوف وہراس کی فضا قائم کیے رکھنا جیسے کئی سوال ذہنوں میں اُبھرتے ہیں۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو مابعد نائن الیون انسان کے اجتماعی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

حواشی

(۱) شاہ محی الحق فاروقی (مترجم)، دہشت گردی کے بارے میں جاننے کے لیے دس باتیں، از مارک لیوائن، مشمولہ دنیازاد، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۶، مئی ۲۰۰۲ء، ص ۲۰

(۲) اعجاز احمد، رانا (مترجم)، امریکا کی عوامی تاریخ، (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۱۱ء)، ص ۴۷۴

(۳) سہیل احمد (مرتب)، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، مقالات بین الاقوامی ادبی سیمی نار، ۷ تا ۱۱/اگست، ۲۰۱۰ء باڑہ گلی سمر کیمپس، (پشاور: ادارہ ادبیاتِ اُردو، فارسی ولسانیات، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۱

(۴) شمیم حنفی، تاریخ کا تشدد اور ہماری تخلیقی حسیت، مشمولہ دنیا زاد، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۶، مئی ۲۰۰۲ء، ص ۱۷

(۵) احمد اعجاز، شناخت کا بحران، (ملتان: دستک پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۹

(۶) الطاف فاطمہ، دیدا وید، مشمولہ فنون، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲۱، ص ۱۴۶

(۷) خالدہ حسین، ابنِ آدم، مشمولہ مکالمہ، کراچی، 'ہم عصر اُردو افسانہ'، جنوری ۲۰۰۸ء تا جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۲۴۴

(۸) محمد حمید شاہد، مرگ زار، (کراچی: اکادمی بازیافت اُردو بازار، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۱۲

(۹) ایضاً، ص ۱۰۵

(۱۰) محمد حامد سراج، وقت کی فصیل، (اسلام آباد: پورب اکادمی، اگست ۲۰۰۹ء)، طبع دوم، ص ۱۱۹

(۱۱) ایضاً، چوب دار، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۸ء)، طبع اوّل، ص ۱۴۳۔۱۴۲

(۱۲) ایضاً، وقت کی فصیل، ص ۲۳

(۱۳) لیاقت علی، مکوڑے، مشمولہ نقاط، فیصل آباد، جون ۲۰۱۰ء، ص ۵۱۸

(۱۴) ایضاً، پرچھائیاں، مشمولہ نقاط، گجرات، کتابی سلسلہ نمبر ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۲

(۱۵) انور زاہدی، یہ جنگل کٹنے والا ہے، مشمولہ مندر والی گلی، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، س۔ن)، ص ۱۴۷

(۱۶) گلزار ملک، اگ، (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، بار اوّل، ص ۹۸

(۱۷) ایضاً، اندھوں کی بستی میں محبت، (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۸۰

(۱۸) مصطفیٰ کریم، عجائب گھر، مشمولہ دنیا زاد، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۲۵، ص ۱۳۶

(۱۹) نیلوفر اقبال، سرخ دھبے، اوپریشن مائس II، مشمولہ، فنون، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲۱، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۲

(۲۰) عطیہ سیّد، بلقیان کابت، مشمولہ، فنون، لاہور، شمارہ نمبر ۱۱۹، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۵۔۱۹۴

(۲۱) نجم الحسن رضوی، میلہ مویشیاں، مشمولہ سیپ، کراچی، شمارہ نمبر ۸۰، ص ۵۴

(۲۲) علی حیدر ملک، دہشت گرد چھٹی پر ہیں، مشمولہ، سمبل، اسلام آباد، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۱

(۲۳) عرفان احمد عرفی، رئیلٹی شو، مشمولہ، سمبل، اسلام آباد، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۴۔۳، ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۵

مآخذ:

(۱) احمد، سہیل (مرتب)، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، مقالات بین الاقوامی ادبی سیمی نار، ۷ تا ۱۱/اگست، ۲۰۱۰ء باڑہ گلی سمر کیمپس، پشاور: ادارہ ادبیاتِ اُردو، فارسی ولسانیات، ۲۰۱۰ء

(۲) اعجاز، احمد، شناخت کا بحران، ملتان: دستک پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

(۳) اعجاز احمد، رانا (مترجم)، امریکا کی عوامی تاریخ، از ہاورڈ زِن، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۱۱ء

(۴) زاہدی، انور، یہ جنگل کٹنے والا ہے، مشمولہ مندر والی گلی، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، س۔ن

(۵) سراج، محمد حامد، وقت کی فصیل، اسلام آباد: پورب اکادمی، اگست ۲۰۰۹ء، طبع دوم

(۶) _____، چوب دار، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۸ء، طبع اوّل
(۷) شاہد، محمد حمید، مرگ زار، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء
(۸) ملک، گلزار، آگ، فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، بار اوّل
(۹) _____، اندھوں کی بستی میں محبت، فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

رسائل:

(۱) ادارہ ادبیاتِ اُردو، فارسی ولسانیات، پشاور، ۲۰۱۰ء
(۲) دنیازاد، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۶، مئی ۲۰۰۲ء
(۳) _____ نمبر ۲۵، س۔ن
(۴) سمبل، اسلام آباد اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء
(۵) سیپ، کراچی، شمارہ نمبر ۸۰
(۶) فنون، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲۱، ۲۰۰۳ء
(۷) نقاط، فیصل آباد، ۹ جون ۲۰۱۰ء
(۸) نقاط، گجرات، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء
(۹) مکالمہ، کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء تا جولائی ۲۰۰۹ء